

وقت کا اہم ترین سوال

فقہی قوانین کی دینی حیثیت

# فقہی قوانین کی دینی حیثیت

انسان ظہراناً مادی الطبع واقع ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کے لئے بل جل کر رہنا ضروری ہے۔ انفرادی زندگی میں (یعنی جہاں ایک فرد تنہا زندگی بسر کرے) کوئی تصفیہ طلب معاملہ پیدا نہیں ہوتا لیکن اجتماعی زندگی میں اس قسم کے معاملات کا نمودار ہونا ناگزیر ہے۔ جب دو انسانوں میں کوئی نزاع پیدا ہو جائے تو اس کے لئے کسی ثالث کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کے متنازع فیہ معاملہ میں تصفیہ کرے۔ جو صورت دو افراد میں پیدا ہو سکتی ہے وہ عام معاشرہ میں بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے لئے بھی کسی ثالث کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ضرورت کے پورا کرنے کے لئے انسانوں نے اپنے لئے ایک نظام وضع کیا جسے نظام حکومت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس کی ابتدائی شکل تو قبائلی یا پنپائیت کی سی تھی لیکن اس کے بعد جب اس نے وسعت اختیار کر لی تو کسی یا تادم ثالث کی ضرورت پیش آئی۔ اس ثالث کو حاکم کہہ کر پکارا گیا۔ یعنی فیصلہ کرنے والا۔ اسے شخصی حکومت کہتے ہیں۔ یعنی وہ حکومت جس میں ایک فرد کا حکم قول فیصل قرار پا جاتا تھا اور اس کی نافرمانی مستوجب سزا ہوتی تھی۔ بالفاظ دیگر اس میں جملہ افراد مشورہ اپنے ہی جیسے ایک انسان کے محکوم ہوتے تھے۔ انسانی تمدنی زندگی آگے بڑھی تو احکام کی جگہ قانون کا تصور پیدا ہوا۔ احکام اور قانون میں فرق یہ تھا کہ حکم تو وقتی ہوتا تھا لیکن قانون سے مراد یہ تھی کہ جب تک اسے بدلنا چاہئے وہ کارفرما ہے۔ اُس وقت سوال یہ پیدا ہوا کہ اس قسم کے قوانین کون وضع کرے۔ قانون کی حکمرانی کے زیادہ میں یہ جو ہم نظام حکومت کی مختلف شکلیں دیکھتے ہیں تو یہ درحقیقت انسان کی اسی کوشش کے مختلف مظاہروں کا نام ہے جس کی رو سے وہ طے کرنا تھا کہ قانون سازی کے اختیارات کے حاصل ہونے چاہئیں۔ اس کی آخری شکل نظام جمہوریت ہے۔ لیکن عہد کہن کی شخصی حکومت ہو یا عصر حاضر کی جمہوریت، اس میں انسان بہر حال اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے فیصلوں کا محکوم رہتا ہے۔

۲۔ انسان کی ان تمام کوششوں کے برعکس اللہ تعالیٰ نے ایک دین عطا فرمایا جس کی بنیاد احترام انسانیت اور شرف آدمیت پر تھی۔ اس نے کہا کہ ہر انسان انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکرمیم ہے۔ اس لئے یہ چیز شرف انسانیت کے منافی ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم ہو۔ وہ ایک انسان ہو یا انسانوں کا کوئی گروہ، وہ کسی کا محکوم ہو یا انسانوں کا وضع کردہ قانون۔ بات ایک ہی ہے۔ اس میں انسان دوسرے انسانوں کا محکوم ہوتا ہے اور یہ چیز احترام آدمیت کے منافی ہے۔ اس نے یہ انقلاب آفرین اعلان کیا کہ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ

كُونُوا عِبَادًا لِّمَنْ دُونِ اللَّهِ .... (پتہ)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں۔ خواہ اسے مضابطہ قوانین، اختیار حکمرانی، حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ حاصل ہو کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ حتیٰ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے، کسی انسان کو نہیں، خواہ وہ شخصی حکومت کی شکل میں ہو اور خواہ قانون سازی کے اداروں کی صورت میں۔ حتیٰ کہ نبی تک کو بھی اس کا حق حاصل نہیں۔ بشرط انسانیت کا تحفظ اسی صورت میں ممکن ہے کہ حکم دینے یا قانون صادر کرنے کا حق انسانوں سے بالاکسی ہستی کو ہو۔ اس ہستی کو اللہ کہا جاتا ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو تسلیم کر لیں انہیں مومن۔ یعنی خدا پر ایمان لانے والے کہہ کر پکارا جائے گا۔ بالفاظ دیگر ایمان باللہ کا بنیادی مفہوم یہ ہے کہ حق حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں صرف خدا کو حاصل ہے۔

اس ایمان باللہ کے بعد لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ نہیں کہیں دکھائی دیتا ہے نہ وہ ہمارے سامنے

آتا ہے۔ نہ ہم اپنے کانوں سے اس کی بات سن سکتے ہیں تو اس کے احکام کی اطاعت کس طرح کی جائے؟ اس کا جواب خدا نے اسی آیت میں دے دیا جس کا ادھا

**کتاب اللہ کی حاکمیت**

حصہ ہم نے اوپر درج کیا ہے۔ اس کا باقی حصہ یوں ہے :

وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّانِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تُخْلَفُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ (پتہ)

میں کسی انسان کی حکومت اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ حکومت صرف خدا کی اختیار کرنی چاہیے اور اس کا تدبیر وہ کتاب ہے جسے اس نے نازل کیا ہے۔ جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور جس کے احکام و مطالب تم اپنے دل و دماغ میں جاگزیں کرتے ہو۔

آپ غور کیجیے کہ قرآن کریم نے کیسے مبلغ انداز سے اس بات کو سمجھا دیا کہ خدا کی حکومت اختیار کرنے کا قابل عمل طریقہ کیا ہے۔ آپ غور کیجیے کہ آج اس دور میں جسے انتہائی تہذیب و تمدن کا زمانہ کہا جاتا ہے، مبنی بر عدل حکومت کا تصور یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے ایک آئین مرتب کرتی ہے۔ اس آئین کو کتاب کی شکل میں شائع کیا جاتا ہے۔ پھر اس آئین کے مطابق قوانین وضع کئے جاتے ہیں اور وہ قوانین بھی کتابوں کی شکل میں عام کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہر متنازعہ فیہ معاملہ کے تصفیہ کے لئے ان کتابوں کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر حکمرانی کتاب کی ہوتی ہے۔ کتاب کی حکمرانی میں کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ وہ لوگ کہاں ہیں جنہوں نے اس کتاب کو مرتب کیا تھا۔ وہ ہمارے سامنے کیوں نہیں آتے۔ ہم ان کی کوئی بات نہیں مانیں گے جب تک وہ ہمیں خود حکم نہ دیں۔ کوئی اس کا تقاضا نہیں کرتا۔ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے یہ بات چودہ سو سال پہلے کہی تھی کہ حکمرانی کتاب رضابطہ قوانین کی ہوتی ہے اور اس کی موجودگی میں اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ صاحب کتاب خود ہمارے سامنے آکر حکم دے تو پھر ہی اس کی اطاعت کی جائے۔ کتاب کی اطاعت درحقیقت کتاب دینے والے کی اطاعت ہوتی ہے۔ لہذا اللہ کی اطاعت کی عملی شکل اس کی کتاب کی اطاعت ہے، اور اللہ پر ایمان کا عملی مفہوم اس کی کتاب پر ایمان لانا ہے۔ جو شخص خدا کی کتاب پر ایمان نہیں لانا، اس کا خدا پر ایمان لانا کبھی قابل تسلیم نہیں ہو سکتا۔ اور جو شخص اس کی کتاب کی حکومت اختیار نہیں کرتا وہ خدا کی حاکمیت سے انکار کرتا ہے۔ یہ وجہ ہے جو اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ :

وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ۔ (چرا)

جو لوگ خدا کی کتاب کی محکومیت اختیار نہیں کرتے وہ تو من نہیں کا فر کہلاتے ہیں۔  
 ۱۲) جس کتاب کی محکومیت اختیار کی جانی مقصود ہو یا نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنی ہر بات کو واضح طور پر بیان کرے۔  
 اس میں کوئی ابہام نہ ہو کسی قسم کا التباس نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی اس خصوصیت کو مختلف مقامات پر واضح کر دیا۔ مثلاً سورۃ النحل میں ہے:-

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۖ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ۔ (۱۳)

اسے رسول! ہم نے تم پر ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جو اپنی ہر بات کو نہایت وضاحت سے بیان کر دیتی ہے۔

۱۴) خدا کی اس محکومیت کا سلسلہ تو شروع سے جاری تھا لیکن چونکہ ان (ابتدائی) ادوار میں نہ انسانی ذہنوں میں ہنوز سمجھنے کی آگئی تھی نہ ان کے علم اور تجربہ میں وسعت پیدا ہوئی تھی، اس لئے انہیں زیادہ تر وقتی اور عارضی احکام دیتے جاتے تھے۔ یہ وجہ تھی کہ ان کی طرف جلدی جلدی رسول بھیجے جاتے تھے اور ان رسولوں کا دائرہ کار بھی محدود ہوتا تھا۔ جب مشیت کے پروگرام کے ماتحت انسانیت سمجھنے کے دور میں پہنچ گئی (یوں کہتے ہیں کہ جب بچہ جوان ہو گیا، تو خدا کی طرف سے ایک ایسا ضابطہ آئین و قوانین نازل کر دیا گیا جو عالمگیر انسانیت کے لئے کبھی کافی ہو اور آنے والے تمام زمانوں کے تقاضوں کو بھی محیط ہو۔ وہ ہر طرح سے مکمل ہو اور اس میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت نہ پڑے بچپانہ طور پر اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو نازل کر دینے کے بعد فرمایا کہ:-

وَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَىٰ النَّاسِ إِذْ أَنزَلَ فِيهِ سُبْحَانَكَ رَبَّنَا وَنَعْمَ الْفَتْحُ وَإِنَّا لَنَكُونُ لَكَ حَافِظُونَ۔ (۱۵)

ترجمہ رب نے جو کچھ انسانوں کے لئے نازل کیا اسے اس کتاب میں مکمل کر دیا گیا ہے۔ نیز اس میں مندرج قوانین میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ یہ ضابطہ قوانین اس خدا کی طرف سے نازل کردہ ہے جو سب کچھ سنتا سب کچھ جانتا ہے۔

یعنی اس ضابطہ قوانین میں نہ کسی اختلاف کی ضرورت ہوگی اور نہ ہی کسی قسم کے تغیر و تبدل کی۔ اس کے بعد ایک ہی سوال باقی رہ جاتا تھا کہ اگر کسی وقت یہ کتاب حوادث ارضی و سماوی سے ناپید ہو گئی، یا اس میں کسی نے تحریف کر دی، تو پھر کیا صورت ہوگی۔ فرمایا کہ اس کا امکان ہی نہیں۔ اس لئے کہ:-

إِنَّا نَحْنُ نُحَافِظُ الشَّكْرَ وَإِنَّا لَنَكُونُ لَكَ حَافِظُونَ۔ (۱۶)

ہم نے ہی اس کتاب کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمے دار ہیں۔ اس میں نہ تحریف ہو سکے گی اور نہ ہی یہ ضائع ہوگی۔

یعنی قرآن مجید خدا کا مکمل ضابطہ قوانین ہے جس میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کی ضرورت پیش نہیں آسکے گی اور یہ غیر عرف بھی رہے گا اور محفوظ بھی رہے گا۔ اس قسم کی کتاب کے بعد خدا کی طرف سے کسی رسول کے آنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔  
 ختم نبوت اس کا لازمی اور قطعی نتیجہ تھا:-

(۱۷) ہم نے دیکھا ہے کہ دین، مذہب کی طرح خدا اور بندے کے درمیان کسی پرمیوسٹ عقیدے کا نام نہیں جو انسانوں

کے خود ساختہ تصور کی رو سے پوجا پاٹ، بھگتی یا پرستش کے ذریعے قائم ہو سکتا ہے۔ دین انسانوں کی اجتماعی نظام زندگی کا نام ہے۔ جس میں خدا کی کتاب کی حکومت اختیار کی جائے۔ جب ہم نظام زندگی یا حاکمیت اور حکومت کے الفاظ بولتے ہیں تو اس سے لازماً ایک نظام حکومت یا مملکت کا تصور سامنے آتا ہے۔ مملکت کے بغیر کسی کتاب کی حکومت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کو قرآن مجید نے یہ کہہ خود واضح کر دیا کہ دین کا ممکن اسی صورت میں ممکن ہے جب دین کے ماننے والوں کو ملک میں حاصل ہو۔ سورہ النور میں ہے۔

## مملکت کی ضرورت

وَعَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفْنَا الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ (پاکستان)  
جو لوگ اللہ پر ایمان لائیں گے اور صلاحیت بخش کام کریں گے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں زمین پر اپنا اقتدار عطا کرے گا جس طرح اقوامِ سابقہ کی صورت میں کیا گیا تھا تاکہ اس طرح وہ دین ممکن ہو سکے جسے اس نے ان کے لئے منتخب کیا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ جماعتِ مومنین کی اپنی آزاد مملکت کے بغیر دین کا ممکن ممکن ہی نہیں۔ بات بالکل واضح ہے۔ دین کے ممکن کے معنی ہیں کتاب اللہ کی حکومت قائم ہونا اور حکومت لاءالہ اپنی آزاد مملکت ہی میں قائم ہو سکتی ہے! — آج کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ آئین پاکستان اسی صورت میں کارفرما ہو سکتا ہے جب مملکت پاکستان موجود ہو۔  
ہمنا مندرجہ بالا آیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جس مملکت میں دین کا ممکن مقصود ہو، وہ ظلم اور استبداد، دھاندلی اور سلب و نہب سے حاصل نہیں کی جاتی۔ وہ خدا کی حاکمیت پر ایمان اور اس کے مطابق صلاحیت بخش پر وگرام کی رو سے حاصل ہوتی ہے۔ بہر حال ہم کہہ رہے ہیں کہ دین کا ممکن — یعنی کتاب اللہ کی حکومت — اپنی آزاد مملکت ہی میں ممکن ہے۔ سورہ الحج میں ہے :-

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ إِنَّهُ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ..... (آیت ۱۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور اتانے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں گے جن امور کو کتاب اللہ نے جائز قرار دیا ہے انہیں مکمل کرنا ذکر کریں گے۔ جنہیں اس نے ناجائز ٹھہرایا ہے ان پر پابندی عائد کریں گے۔ مختصراً یہ کہ ان کا ہر معاملہ انجام کار خدا کے قوانین کے مطابق طے پائے گا۔

اس مقام پر ایک بڑا اہم اور غور طلب نکتہ سامنے آتا ہے۔ ہمارے مفسرین نے قرآن مجید کی سورتوں کو مکی اور مدنی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہم ان کے معیار تقسیم کے متعلق تو سر و دست کوئی بات نہیں کرنا چاہتے لیکن اس اہم حقیقت کو سامنے لانا چاہتے ہیں کہ مکی آیات کی سورتوں میں کہیں ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ (اے جماعتِ مومنین) نہیں آیا۔ ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ“ (اے لوگو!) ہی آیا ہے۔

## يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ مدنی آیات ہی میں آیا ہے۔ مکی زندگی میں اکثر حضرات اسلام لے آتے تھے۔ لیکن چونکہ ان کی زندگی ہنوز انفرادی تھی اس لئے انہیں ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ کہہ کر مخاطب نہیں کیا گیا۔ مدنی زندگی میں جب انہیں اقتدار حاصل ہو گیا اور انہوں نے اپنی مملکت قائم کر لی تو اس وقت ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ کے مخاطب

کے اہل قرار پائے۔ اس سے واضح ہے کہ ارباب ایمان یا یہاں الذین اٰمنوا کہہ کر پکارے جانے کے مزاوار اس وقت ہوتے ہیں جب انہیں اقتدار حاصل ہو جائے اور وہ کتاب اللہ کی حکومت قائم کر سکیں۔ اسی کو اسلامی نظام کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، خدا پر ایمان کا عملی مفہوم کتاب اللہ کی حاکمیت ہے۔ یہی کفر اور ایمان میں حتمی امتیاز ہے۔ جیسا کہ اس نے کہا ہے۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ جو کتاب اللہ کی حاکمیت قائم نہیں کرتے انہیں کافر کہا جاتا ہے۔

سب سے پہلے اس قسم کی مملکت نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ میں مدینے میں قائم ہوئی اور اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے ارشاد فرمایا کہ :-

فَأَحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ - (۲۳)

اے رسول! تم ان لوگوں کے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو۔

اور وحی خداوندی نے حضورؐ کی زبان مبارک سے یہ اعلان کر دیا کہ :-

أَفْخِرَ اللَّهُ أَذْنٰبِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا - (۲۴)

اے لوگو! (جو انسانوں کی حکومت کے شوگر ہو چکے ہو) کیا تم چاہتے ہو کہ میں بھی خدا کو چھوڑ کر انسانی حاکم تسلط کروں حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب نازل کر دی ہے جو اپنی ہر بات کو نکھار کر بیان کر

دیتی ہے۔

آپؐ نے حضورؐ فرمایا کہ وہ جو (آیت ۲۳ میں) کہا گیا تھا کسی نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر اپنی حاکمیت قائم کرے، نبی اکرمؐ کی زبان مبارک سے اس طرح واضح الفاظ میں اس کا اعلان کرا دیا۔ بلکہ یہاں تک کہلا دیا کہ :-

قُلْ إِنِّي أَخَافُ أَنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ - (۲۵)

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ اگر میں بھی خدا کے کسی حکم کی نافرمانی کروں تو میں بھی اس کے عذاب الیم سے ڈرتا ہوں۔

غور فرمائیے کہ حضورؐ نبی اکرمؐ کو مثال کے طور پر پیش کر کے انسانوں پر انسانی حکومت کے تصور کی کس طرح جڑ کاٹ کر رکھ دی! یہاں تک یہ واضح ہو گیا کہ نظام خداوندی میں جسے الدین کہا جاتا ہے، حکومت صرف کتاب اللہ کی ہو سکتی ہے۔ لیکن کتاب اللہ کی صورت یہ ہے کہ اس میں متعین احکام محدود سے ہیں اور زندگی کے باقی معاملات کے متعلق صرف اصول اور اقدار دیئے گئے ہیں جنہیں حدود اللہ کہہ کر پکارا گیا ہے اور جماعت مومنین کا فرض ہے ان حدود کا تحفظ قرار دیا گیا ہے۔ وَالْحِفْظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ - (۲۶)۔ ان اصول و اقدار کو حدود کہنے میں ایک عظیم

**حُدُودِ اللَّهِ**

حقیقت پوشیدہ ہے۔ جس کتاب کو تمام زمانوں اور تمام اقوام عالم کے لئے ضابطہ حیات اور آئین زندگی قرار پانا تھا اسے ہونا ہی ایسا چاہیے تھا کہ اس میں ابدی مستقل، غیر متبدل حدود متعین کر دیئے جاتے۔ اور اس کتاب کی حاکمیت قائم کرنے والوں کو اس کی آزادی ہوتی کہ وہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے جزئی قوانین اور وقتی



احکام خود متعین کریں۔ یہ جزئی قوانین حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہیں گے اور خدا کی مقدر کردہ حدود اپنی جگہ محکم اور غیر متبدل رہیں گی۔ اگر اس کتاب میں جزئی قوانین بھی خود ہی متعین کر دیئے جاتے تو یہ کتاب عالمگیر انسانیت اور زمانے کے بدلنے والے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکتی۔ جزئی قوانین ابدی اور غیر متغیر ہو نہیں سکتے۔

حدود اللہ کے علاوہ قرآن مجید میں جو چند احکام آئے ہیں وہ بھی ابدی ہیں، لیکن ان کے متعلق قرآن کریم نے حکمت ملحوظ رکھی ہے کہ جن حالات میں انہیں نافذ کیا جائے گا اور جس طریق سے ان پر عمل پیرا ہو جائے گا انہیں قرآن نے خود متعین نہیں کیا۔ ان حالات کی روشنی میں 'طریق کار' کا تعین ہر دور کی قرآنی مملکت خود کرے گی۔

(۸) یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان جزئی قوانین کا تعین کس طرح سے کیا جائے گا۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے خود ہی طے فرمادیا کہ یہ کچھ جماعت 'مومنین' کے باہمی مشورہ سے کیا جائے گا۔ آپ غور فرمائیے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے نظام مشاورت کا تصور ہی نہیں، اس کے قیام کا حکم دینا کیسی عظیم حکمت بالغہ ہے۔

## نظام مشاورت

منہذا آج کل عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ مغربی نظام جمہوریت کے دلدادہ اس نظام کی تائید میں قرآن کے نظام مشاورت کو بطور سند پیش کر دیتے ہیں۔ انہیں کون بتائے کہ قرآن کے نظام مشاورت اور مغرب کے جمہوری نظام میں کفر اور اسلام کا فرق ہے۔ قرآن کے نظام معاشرت میں یہ مشاورت قرآن کی قائم کردہ غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی کارفرما ہو سکتی ہے۔ لیکن مغربی نظام جمہوریت میں قانون سازی کے اختیارات پر کسی قسم کی حدود اور قیود عائد نہیں ہوتے۔ اس میں اکثریت کا فیصلہ حق قرار پاتا ہے۔ یہاں ایک بڑا بصیرت افروز نکتہ سامنے آتا ہے۔ سودہ انعام کی دو آیات پہلے درج کی جا چکی ہیں۔ یعنی آیت (۱۱۱) جس میں یہ کہا گیا کہ خدا کے سوا کوئی حاکم تسلیم نہیں کیا جاسکتا اور اس نے اپنی حاکمیت کے لئے مفصل کتاب نازل کر دی ہے۔ اس کے ساتھ آیت (۱۱۲) میں کہا گیا کہ یہ کتاب مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ ازاں بعد خدا نے صبیح و عظیم نے فرمایا:

وَاِنْ تَطْلُعْ اَكْثَرُ مَنْ فِي الْاَرْضِ يَخْرُصُوْنَ - (۱۱۲)

اگر تو اکثریت کا اتباع کرنے لگ جائے تو وہ بھگے خدا کے راستے سے گمراہ کر دیں گی۔ جو لوگ (وحی کی قیود کو اپنے اوپر عائد نہیں کرتے) وہ حق و صداقت کی نہیں بلکہ ظن و قیاس کی پیروی کرتے ہیں۔

آپ دیکھیے کہ خدائے صبیح و عظیم نے کس طرح چودہ سو سال پہلے موجودہ دور کے نظام جمہوریت کو باطل اور گمراہ کن قرار دے دیا۔ بلا حدود و قیود قانون سازی کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔ انسانوں کو اس قسم اختیارات کا حامل تسلیم کر لینا انہیں مقام الوہیت عطا کر دینا ہے جو شرک عظیم ہے۔ قرآن حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے مشاورت کی اجازت دیتا ہے۔

(۹) جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ پہلی قرآنی مملکت رسول اللہ نے قائم فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو حکم دیا گیا کہ:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (۱۱۳)

مملکت کے معاملات میں اپنے رفعت سے مشورہ کیا کرو۔

یہ ظاہر ہے کہ جو معاملہ باہمی مشورہ سے طے کیا جائے گا وہ احکام خداوندی کی طرح غیر متبدل نہیں ہو سکتا۔ اول تو وہی مجلس مشاورت

جس نے ایک فیصلہ کیا تھا، مزید غور و فکر کے بعد، یا حالات کی تبدیلی کے تقاضے کے تحت خود اپنے فیصلہ میں تبدیلی کر سکے گی یا بعد میں آنے والی مجلس مشاورت ایسا کرنے کی مجاز ہوگی۔ اس طرح حدودِ اشد تو اپنے مقام پر محکم اٹل اور غیر متبدل رہیں گی اور ان کے اندر رہتے ہوئے جو کچھ باہمی مشاورت سے طے پائے گا وہ قابلِ تغیر و تبدل ہوگا۔ یہ نظام نبی اکرمؐ اور حضورؐ کے سچے جانشینوں کے زمانے میں قائم رہا اور مشاورت سے طے پائے ہوئے امور میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ قرآن کے اسی نظام کا نام استخلاف فی الارض یا اسلامی مملکت ہے۔ قرآن کا منشا یہ تھا کہ امتِ مسلمہ میں یہ نظام اسی طرح مسلسل قائم رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں متنبہ کر دیا تھا کہ دیکھنا کہیں اس رسول کی وفات کے بعد کچھ سے اس نظام کہن کی طرف نہ پٹ جانا جس میں خدا کے بجائے انسانوں کی حکومت قائم ہوتی تھی۔ (یٰٰسے)

اسلامی مملکت کے عناصر

آگے بڑھنے سے پیشتر اس نظام یا مملکت کے بنیادی عناصر ترکیبی ایک بار پھر سامنے لے آئیے۔ یعنی :-

(۱) ان لوگوں پر مشتمل ایک امت جن کا ایمان یہ تھا کہ حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے اور اس کی یہ حکومت اس کی کتاب کی روش سے قائم ہوتی ہے۔

(۲) اس کتاب میں نازل کردہ احکام و اصول و اقدار جنہیں حدودِ اشد کہا جاتا ہے، ابدی اور غیر متبدل ہیں اور ان کی روشنی میں جزئی احکام و قوانین امت کے باہمی مشورے سے طے ہوں گے۔

(۳) جو کچھ اس طرح سے طے پائے گا وہ اس حکومت کی مرکزی اتھارٹی کی طرف سے نافذ ہوگا۔ ان احکام کو احکامِ شریعت سے تعبیر کیا جائے گا۔ اس حکومت کے سوا کسی کو نہ کسی قسم کے احکام وضع کرنے کا حق حاصل ہوگا نہ نافذ کرنے کا اختیار۔ (۴) یہ احکام تمام افرادِ امت پر یکساں نافذ ہوں گے اور انسانی زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہوں گے۔

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہے کہ قرآن کی روش سے اس امت میں نہ الگ الگ فرقے ہوں گے نہ ان فرقوں کے ایک دوسرے سے الگ قوانین نہ ان میں مختلف مقننین کا وجود ہوگا نہ ان کی مرتب کردہ الگ الگ فقہیں۔ ایک امت،

ایک ضابطہ ہدایت، ایک مملکت اور اس کی طرف سے نافذ کردہ ایک ضابطہ قوانین۔ یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہمارے

صدرِ اول کی کوئی مستند اور مصدقہ، بلکہ قابلِ اعتماد تاریخ ہمارے پاس نہیں۔ اس دور کی سب سے پہلی جامع تاریخ تیسری صدی ہجری میں مرتب ہوئی جسے طبرستان کے ایک مؤرخ (امام طبری) نے کسی سحر پری مواد کے بغیر زبانی روایات سے جمع اور

مدون کیا۔ بنا بریں تاریخی طور پر تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ نظام مملکت کتنے عرصے تک قائم رہا لیکن ایک بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ حضور نبی اکرمؐ اور آپؐ کے رفقاء کرامؓ (جنہیں صحابہؓ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) کے دورِ حکومت

تک یہ نظام قائم تھا کیونکہ اس امر کی شہادت قرآن میں موجود ہے کہ وہ مومن حق تے اور مومن حق انہی کو کہا جاتا ہے جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کریں۔ اس کے بعد ہوامیر کے زمانے میں بھی دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے عہد میں امت

میں کوئی فرقہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ اہل تشیع کی حیثیت ایک سیاسی گروہ کی سمجھ لیجئے کیونکہ اس زمانے میں ان کی کوئی الگ فرقہ وجود میں نہیں آئی تھی۔ اور وہ سری بات یہ کہ اس زمانے میں قرآن مجید کے سوا قانون (فقہ) کی کوئی کتاب نظر نہیں آتی۔ اس

سے مترشح ہوتا ہے کہ اس زمانے تک امت، امت واحدہ تھی۔ نہ اس میں مذہبی فرقے وجود میں آئے تھے نہ ان کی الگ الگ فقہیں مرتب ہوئی تھیں۔ یہ کچھ ان کے بعد عباسیوں کے زمانے میں ظہور میں آیا۔ (واضح رہے کہ جو کچھ ہم نے نئی امیہ کے زمانے



کے متعلق لکھا ہے وہ ہمارا تاریخی اندازہ ہے جس کی صحت پر ہم اصرار نہیں کر سکتے۔ نہ ہی اسے ہمارے پیش نظر موضوع سے خاص تعلق ہے۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ قرآنی نظام مملکت کچھ عرصے تک قائم رہا اور اس کے بعد اس میں تبدیلی آگئی۔

(۱)

۱۱) پہلے کہا جا چکا ہے کہ دین کا ممکن قرآنی نظام مملکت کے ساتھ مشروط اور وابستہ ہے۔ یہ نظام نہ رہے تو معاشرہ میں دین کا وجود ہی نہیں رہتا۔ جب قرآنی نظام حکومت کی جگہ ملوکیت آگئی (اور ملوکیت بھی اپنی بدترین شکل۔ یعنی موروثی بادشاہت کے پیکر میں) تو دین باقی نہ رہا۔ اس کی جگہ مذہب نے لے لی۔ اس کے بعد تاریخ کے اس دور سے دو درمیں (یعنی اس زمانے سے لے کر آج تک) مسلمانوں کی حکومتیں تو قائم ہوتی رہیں لیکن اسلامی حکومت کہیں بھی قائم نہ ہوئی۔ ملوکیت نے سب سے پہلے تنزیت کی طرح ڈالی یعنی امور مملکت (جنہیں موجودہ دور کی اصطلاح میں پبلک لائف کہا جاتا ہے) حکومت نے اپنے ہاتھ میں رکھے اور شخصی قوانین ارباب مذہب کی تحویل میں دے دیئے۔ مسلمان بادشاہ، امور مملکت کے متعلق جو فیصلے کرتے انہیں وہ اسلام کا نام دے دیا کرتے تاکہ عوام مطمئن رہیں کہ اسلامی حکومت قائم ہے۔ اس تاثر کو ہمارے علماء کرام کی تائید اور بھی تقویت پہنچاتی تھی۔ وہ ان موروثی بادشاہوں کے حق میں مہراب و منبر سے اتید اللہ بنصرہ اور خلد اللہ ملکۃ کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ انہیں ظل اللہ علی الارض، زمین پر خدا کا سایہ کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ ملوکیت کے اس ماحول میں امور مملکت کے متعلق جس قسم کے فتاویٰ صادر ہو کر آتے تھے اس کا اندازہ اس ایک فتویٰ سے لگائیے جو فقہ حنفی کی مستند کتاب (بہاریہ اولین جمیعہ) میں ان الفاظ میں درج ہے۔

## موروثی بادشاہتیں

کل شیء صنعه الامام الذی لیس فوقہ امام فلاحہ علیہ الاقصا۔  
یعنی جن جرائم کی مزاحمت ہے سربراہ مملکت سے ان میں سے کسی کا مواخذہ نہیں کیا جاسکتا۔ بجز قصاص کے۔ یعنی سربراہ مملکت پر قصاص کے سوا کسی جرم پر حد نہیں لگ سکتی۔ جہاں تک شخصی قوانین کا تعلق ہے چونکہ ان کی تدوین و تنفیذ کے لئے کوئی مرکزی اتھارٹی نہیں تھی، اس لئے مختلف فقہانے اپنے اپنے طور پر قوانین مرتب کر لئے۔ اور ان کے معتقدین نے ان قوانین کا اتباع اپنے اوپر لازم قرار دے لیا۔ اس طرح یہ امت واحدہ فرقوں میں بٹ گئی۔ ان ائمہ فقہاء کی تعداد تو بہت زیادہ تھی لیکن ان میں سے چار نے بڑی شہرت حاصل کی۔ یعنی ۱۔

(۱) امام اعظم (کوئی)	پیدائش ۱۵۰ھ	وفات ۲۴۱ھ
(۲) امام مالک (میں، مدنی)	پیدائش ۱۷۹ھ	وفات ۲۶۱ھ
(۳) امام شافعی (عسقلانی، مکی)	پیدائش ۱۸۰ھ	وفات ۲۴۰ھ
(۴) امام احمد بن حنبل (بغدادی)	پیدائش ۱۹۹ھ	وفات ۲۴۱ھ

(اہل تشیع کی فقہ جعفری ان سے الگ ہے)

شروع شروع میں تو ان ائمہ فقہاء کے متبعین اپنے اجتہاد سے ایسے مسائل بھی وضع کرتے تھے جو ان کے پیشروؤں کے خلاف ہوں نیز ان کے مرتب کردہ مسائل کی قبرست میں حکم و اضافہ بھی کرتے رہتے تھے لیکن رفتہ رفتہ یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور عقیدہ یہ پیدا ہو گیا کہ کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ کسی مسئلہ میں ایسی بات کہے جو اس قول کے مخالف ہو جس کا

فتویٰ اس کے امام نے دیا ہے۔ چنانچہ فقہاء حنفیہ کے پیشوا اور مستم امام ابو الحسن عبید اللہ انصاریؒ نے یہاں تک کہہ دیا کہ:۔  
ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر مجاہد اصحاب ہیں وہ یا تو متول ہے یا منسوخ۔ اور اسی طرح  
جو حدیث اس قسم کی ہو وہ متول یا منسوخ ہے۔

اجتہاد کا دروازہ بند کر دینے کے بعد اُس وقت تک کے دیتے گئے فتاویٰ کو کتابی شکل میں مرتب کر دیا گیا۔ ان مجموعوں  
کا نام فقہ حنفی ہے۔ واضح رہے کہ یہ فقہ امام ابو حنیفہؒ کی مرتب کردہ نہیں۔ یہ حنفی مسلک کے مختلف فقہاء کے فتاویٰ  
کا مجموعہ ہے۔ انہی فتاویٰ کا ایک جامع مجموعہ شہنشاہ عالمگیریؒ کے زمانے میں مرتب کیا گیا جو فتاویٰ عالمگیری کے نام  
سے مشہور ہے۔

مذہب کی حیثیت سے (یعنی دینی حیثیت سے نہیں بلکہ مذہبی حیثیت سے) ان فقہی احکام کی ایک اہمیت  
ضروری تھی اور وہ یہ کہ کم از کم ایک فقہ کے مقلد ایک مسلک سے منسلک رہتے تھے۔ لیکن اسے دینی حیثیت تو کسی صورت  
میں بھی نہیں دی جاسکتی۔ دین کا ممکن تو اسی دن ختم ہو گیا تھا جب قرآنی نظام مملکت باقی نہ رہا تھا۔  
دینی نقطہ نگاہ سے اس میں ایک اور بنیادی خرابی تھی اور وہ یہ کہ انسانوں کے وضع کردہ ان قوانین کو درجہ الوہیت  
دے دیا گیا۔ یہ نکتہ غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔ قوانین خداوندی کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ابدی اور غیر متبدل  
ہیں۔ یہ حیثیت انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو دے دی جاسکتی تو یہ انہیں خدائی حیثیت دے دینے کے مرادف ہو گا۔  
قرآن کریم نے سابقہ اہل کتاب کے خلاف جو یہ اعتراض کیا ہے کہ اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهَبَانَهُمْ أَرْبَابًا  
مِّنْ دُونِ اللَّهِ۔ (۲۰) کہ وہ اپنے مذہبی پیشواؤں کو خدائی درجہ دے دیتے تھے تو اس سے یہی مراد ہے کہ وہ  
ان کے وضع کردہ قوانین کو خدائی قوانین جیسا درجہ دے دیتے تھے اور یہ کھلا ہوا شرک تھا۔ قرآن کریم نے امت میں  
فرقوں کے وجود کو شرک قرار دیا ہے تو اس کی بھی یہی وجہ ہے (۲۱)۔ فرقے کا وجود اس عقیدہ پر قائم ہوتا ہے کہ اسکے  
متبعین اپنے فوٹے کے بانوں کے وضع کردہ عقائد و احکام کو منفرد، ابدی اور غیر متبدل سمجھتے ہیں۔ کوئی دس سال آدمی کی  
بات ہے کہ ہمارے ہاں یہ خیال ابھر کر مروجہ اسلامی احکام کے متعلق کچھ تحقیقاتی کام کیا جائے۔ اس تجویز کی مخالفت کرتے  
ہوئے ہامد اشرفیہ (لاہور) کے مفتی جمیل احمد تھانوی نے ارشاد فرمایا کہ:۔

یہ طے شدہ بات ہے کہ تحقیق و تفتیش کا کام پہلی صدی، دوسری صدی اور تیسری صدی میں پایہ تکمیل تک  
پہنچ چکا ہے۔ اسی کا نام فقہ اسلامی ہے جو ائمہ ہدٰی کی تحقیقات کا مجموعہ ہے۔ لہذا اگر تحقیقات  
اسلامی سے ایسے ایسے مفہومات مراد ہوں جو مکمل اور متعین شدہ موجود ہیں تو موجودہ دور کی تحقیق اگر اس کے  
مطابق ہے تو بلا ضرورت ہے اور اگر وہ تحقیق اس کے خلاف ہے تو مردود ہے۔ اس پر امت محمدیہ کا

لے تادیب التشریع الاسلامی۔ مؤلف علامہ محمد العزیز کا اردو ترجمہ۔ "تاریخ فقہ اسلامی"۔

شائع کردہ: دار المصنفین۔ اعظم گڑھ۔ ص ۲۱

۱۔ ائمہ فقہ کی تقنینی قابلیت مسلم۔ ان کا فتویٰ اور دیا منت بھی شک و شبہ سے بالا۔ لیکن اس کے باوجود وہ تھے انسان ہی۔ انہیں مقام  
انسانیت سے بلند تصور کر کے الوہیت کے درجہ پر سرفراز کر دینا، وہ غلو فی الدین ہے جس سے قرآن کریم نے سختی سے منع کیا ہے۔

اجماع ہے۔ (بحوالہ ایشیا۔ سہ اگست ۱۹۶۸ء)  
یہ ہے فقہی قوانین کے متعلق وہ عقیدہ جو مسلسل چلا آ رہا ہے۔

(۱۰) یہ صورت صدیوں سے مسلسل چلی آرہی تھی کہ فطرت کی کرم گسری سے ہمارے ہاں ایک ایسا دیدہ وریدا ہوا اقبال کے نام سے معروف ہے۔ اس کی نگہ بصیرت نے جب "عالم اسلام" (یعنی مسلمانوں کے ممالک) پر غور کیا تو اس نے دیکھا ان میں کسی جگہ بھی نہ اسلامی حکومت قائم ہے نہ اسلام اپنی صحیح شکل میں کارفرما۔ یہاں **اقبال کی نگہ بصیرت** خلافت کی جگہ ملکیت نے لے رکھی ہے اور دین کی جگہ مذہب نے۔ اس نے اس کے خلاف جہاد کا عزم کیا اور ساری عمر اس پر قائم رہا۔ اس نے دیکھا کہ ان تمام خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ خلافت کی جگہ ملکیت نے لے رکھی ہے۔ (خلافت سے مراد ہے قرآنی نظام حکومت جو صدر اول میں قائم ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے اس کے خلاف نعرہ بلند کیا اور کہا کہ :-

خلافت بر مقام ناگواہی است      حرام است آنچہ بر بادشاہی است  
ملوکیت ہر مکر است و نیزنگ      خلافت حفظ ناموس الہی است

(ارمغان محراب، ص ۱۲)

انکے صفحے پر لکھتے ہیں :-

بنو اندر جہاں آدم غلام است      نظامش خام و کارش ناقام است  
غلام فقیر آن گیتی پس ہم      کہ در دیش ملکیت حرام است

یہ بہت بڑا انقلابی نعرہ تھا اور مغرب و عجم کے خلاف اعلان جنگ۔ اسے اس کا پورا پورا احساس تھا کہ اس اعلان کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اسی بنا پر اس نے کہا تھا کہ :-

دراخت با ملکیت کلیے      فقیرے بے کلا ہے، بے خطیے  
گہے با شد کہ باز یہاںے تقدیر      بگسید کار صرمر از سنیے

۱۲۴

اسے معلوم تھا کہ اس انقلابی نعرہ کی مخالفت میں مذہبی پیشوائیت سب سے پہلے میدان کارزار میں سامنے آئے گی۔ اقبال کے کلام میں ملاقا کے خلاف جو کچھ کہا گیا ہے وہ کسی خاص شخصیت یا گروہ کے خلاف نہیں۔ وہ مذہبی پیشوائیت کے مسلک اور وجود کے خلاف ہے جو صدیوں سے مسلمانوں کے غیر اسلامی نظام کو اسلامی کہہ کر پیش کر رہا تھا۔ ملکیت اور مذہبی پیشوائیت کی مخالفت، اس جنگ کا منہی پہلو تھا۔ اس کے مثبت پہلو کے سلسلہ میں اقبال نے جانتا تھا کہ اسلامی نظام کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک اسے عملی شکل میں سامنے نہ لایا جائے۔ اور ایسا کیا جانا ایک ایسی آزاد مملکت ہی میں ممکن ہے جس میں پہلے سے کوئی نظام قائم نہ ہو۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے مملکت پاکستان کا تصور دیا۔ انہیں معلوم تھا کہ اس مملکت میں پہلا سوال یہ سامنے آئے گا کہ اس میں اسلامی قوانین کس اصول کے مطابق مدون کئے جائیں۔ اس سوال کے ضمن میں انہوں نے بڑی تفصیل سے گفتگو کی اور علاوہ دیگر مقامات، انہوں نے اپنے مشہور خطابات میں ایک پورا خطبہ اسی موضوع کے لئے وقف کر دیا ہم اس خطبہ کے چیدہ چیدہ اقتباسات پیش قارئین کرتے ہیں۔

## خطبہ اقبال کے اقتباسات

”اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیات کلی کی روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے۔ لیکن اس کی خود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلق کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر (جیسے متغیر و عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اُس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکاسکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں۔۔۔ وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے۔۔۔ تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوتی ہے، یکسر جامد و متصاب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصول حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصول تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہذا، دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع اور ترکیب میں کون سا اصول حرکت کا فرما رہا ہے؟ یہ وہی اصول ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں؟“

اس کے بعد وہ اس خطبہ میں مسند اجتہاد پر بڑی تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ وہ اجتہادِ مطلق کو اسلام کا بنیادی اصول قرار دیتے ہیں۔ یعنی قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون سازی کا مکمل اختیار۔ وہ اس اجتہاد کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔۔۔

”مستی حضرات، فطری طور پر تو اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کا اجتہاد ممکن ہے لیکن ائمہ فقہ کے مذاہب کے قیام کے بعد عملاً اس کا دروازہ بند ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کے اجتہاد کے لئے جن شرائط کو ضروری قرار دیا جاتا ہے، ان کا پورا کرنا کسی ایک فرد کے لئے قریب قریب ناممکن ہے۔ ایک ایسے نظامِ شریعت میں جس کی بنیاد قرآن پر ہو جو زندگی کے متعلق حرکیاتی اور ارتقائی تصور کا علمبردار ہے، اس قسم کی ذہنیت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے۔ لہذا، آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اسباب و علل کا انکشاف کریں جن کی وجہ سے یہ ذہنیت پیدا ہوئی جس نے قانونِ شریعت کو یکسر منجمد بنا کر رکھ دیا۔“

ہم اس وقت ان اسباب و علل کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے جنہیں علامہ اقبال نے اس مجود و قنطل کا ذمہ دار گردانا ہے۔ ان میں سے دو ایک اہم نکات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ وہ (اپنے اسی خطبہ میں) لکھتے ہیں۔۔۔

”آئیے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی دوسری یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی ماہمائی سے ہماری قدیم فقہانے قانونِ شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے۔ اور تاریخ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظامِ زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اصل



کامیابی حاصل ہوتی تو اس کا کم از کم آدھا حصہ انہی فقہاء کی بالغ نظری کا رہن منت تھا چنانچہ فان کہ میرا اس ضمن میں لکھتا ہے کہ

رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں سوائے عربوں کے اور کوئی قوم ایسی نہیں جس کے پاس اس قدر احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام ہو۔

لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں حتیٰ اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علماء اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہب (اربعہ) اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم ہیں۔ لیکن نظری طور پر اجتہاد مطلق کے امکان سے انہیں بھی کبھی انکار نہیں ہوتا۔ میں نے (پچھلے صفحات میں) ان اسباب و علل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں اور دنیا کے اسلام ان تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکری انسانی کی نشو و ارتقاء سے وجود میں آگئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہب فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے کبھی اپنی تعبیرات و تاویلات کو کبھی قطعی، کامل، مختتم اور سہو و غلط سے مبرا سمجھا ہے کبھی نہیں! اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں، فقہ کے اصول اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرز عمل میرے خیال میں بالکل سچا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عمل ارتقاء ہے، اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی لے سکتے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔“

وہ اس قسم کی ماضی پرستی کہ تاریخ کا جھوٹا احترام قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ کہتے ہیں کہ:۔  
”قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا، جیسا کہ دورِ حاضر کے ایک مصنف نے لکھا ہے کہ:-

”تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں، ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے جنہوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو۔

تقریباً صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی جھوٹی تقلیدیں سے جماعتی نظم کو جامد اور مستحکم طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے کیر خلافت تھا۔“  
اور اس نکتہ کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

”اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا، اسلام کے خلاف افتری ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوتی کہ مسلمانوں میں قانون کے تصور نے ایک خاص معین شکل اختیار کر لی اور ایک وجہ یہ کہ قوموں کے زوال کے زمانہ میں ذہنوں میں اس قدر جمود اور تساہل پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین کو (انسان سمجھنے کے بجائے) مہبود بنا دیا جاتا ہے۔ اگر علماء کے متاخرین میں سے بھی بعض نے اس ”افتراء“ کو برقرار رکھا ہے تو وہ ان کا اپنا فعل ہے۔ دورِ حاضر کا مسلمان اس کا پابند نہیں کہ جس طرح انہوں نے برضا و رغبت اپنی فکری آزادی کو (اپنے خود ساختہ مہبودوں کی) نذر کر دیا تھا۔ یہ کبھی اپنی آزادی کو سلب ہو جانے دیں۔



علامہ سرخسیؒ (دسویں صدی میں) لکھتے ہیں :-

اگر اس افترار کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے زمانے کے مفکرین و معتنفین کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں، اور ان کے مقابلہ میں متاخرین کے رستے میں بہت سی دشواریاں ہیں، تو ایسا سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ اس لئے کہ اس معمولی سی بات کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ متقدمین کے مقابلہ میں متاخرین کے لئے اجتہاد زیادہ آسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب قرآن اور سنت کی اس قدر تفسیریں اور شرحیں لکھی جا چکی ہیں کہ ہمارے زمانے کے مجتہد کے پاس تعبیرات کے لئے کافی سے زیادہ مسالہ موجود ہے (جو متقدمین کے پاس نہیں تھا)۔

ارباب علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ یہ نظریہ کہ کسی ایک دور کے قوانین ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہوتے ہیں، سب سے پہلے امام شافعیؒ نے پیش کیا تھا اور یہ سن کر آپ کو شاید حیرت ہو کہ اس کی مخالفت امام اعظمؒ نے کی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے ان کی اس بحث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا :-

» امام شافعیؒ نے اپنے آپ کو صرف ان نظائر کے دائرہ میں محدود کر لیا جو عہد رسالت مآبؐ اور عہد صحابہؓ میں وقوع میں آئے تھے۔ اس سے ان کی نگاہ کا دائرہ بہت تنگ ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے بات تو یہاں سے شروع کی تھی کہ اہمیت ٹھوس واقعات کو حاصل ہے۔ لیکن انہوں نے (ایک خاص دور کے) ٹھوس واقعات کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لیا، اور خاص واقعات سے متعلق احکام کو اس قسم کے ملتے جلتے واقعات پر منطبق کرنے کے لئے قیاس سے شاذ و نادر کام لیا۔ ان کے برعکس، ان کی سنت تنقیدیں مذہب حنفیہ کے لئے (ایک اور رنگ ہیں) بڑی مفید ثابت ہوئیں۔ اس سے انہوں نے محسوس کر لیا کہ اصول قانون سازی کی تعبیر میں، زندگی کی حقیقی (واقعاتی) نقل و حرکت اور تنوع کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مکتب فقہ جس نے ان مباحث کے نتائج کو اچھی طرح جذب کر لیا تھا، اپنے خاص الخاص اصول فقہ میں بالکل آزاد ہے اور دیگر مذاہب فقہ اور تشریع کے مقابلہ میں، حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔  
اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں :-

» لیکن جاتے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے خود اپنے مکتب فقہ کی روح کے خلاف، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے فقہاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے، بعینہ اسی طرح جس طرح امام ابوحنیفہؒ پر تنقید کرنے والوں نے ان فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے لیا تھا جو عہد رسالت مآبؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ مقامات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے تھے۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، علامہ اقبالؒ کو اس کا احساس تھا کہ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ان کے اس نظریے کی شدت سے مخالفت ہوگی چنانچہ انہوں نے لکھا :-

» مجھے اس میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ اگر اسلامی قانون سے متعلق ضخیم لٹریچر کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اس سے دور حاضر کے ناقدین کے اس سطحی خیال کی تردید ہو جائے گی کہ اسلامی قانون جامد اور ناقابل ترقی ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ ابھی اس کے لئے تیار نہیں کہ قانون سازی کے مسئلہ کے متعلق تنقیدی فقط نگاہ سے گفتگو کی جائے۔ اگر کسی نے اس بات کو اٹھایا تو یہ اقدام بہت سے لوگوں کے لئے وجہ ناراضگی ہو جائے گا اور مخالفت کا دروازہ کھول

دے گا۔ بایں ہمہ، میں اس باب میں کچھ عرض کرنے کی جرأت کروں گا۔

اس سے بھی بہت پہلے انہوں نے (صوفی فلاں مصطفیٰ تبسم) (مجموعہ کے نام) اپنے ایک خط میں لکھا تھا: ”ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادت انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔ نیز جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص موخر الذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت تک مروج ہیں، ان پر قرآنی نقطہ نگاہ سے تنقید کیا جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوع انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطہ نگاہ سے زمانہ حال کے ”جورس پرڈوش“ یعنی اصول فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور وہی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔ قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں، یا قوانین اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں (سوائے ایران و افغانستان کے) مگر ان ممالک میں بھی امروز و فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے مگر افسوس ہے کہ زمانہ حال کے اسلامی نقباء یا تو زمانہ کے میلان طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدین شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت نے بہار اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکام قرآنی کا ہی منکب ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بڑے عالم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا نظریہ ناممکن ہے۔ غرضیکہ یہ وقت عملی کام کا ہے کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہب اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔“

علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ”جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علمائے خود اپنے مکتب فقہ کی روح کے خلاف امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے۔“ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ امام اعظمؒ اپنے فتاویٰ کو کبھی ابدی اور غیر متبدل قرار نہیں دیتے تھے۔ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے۔

نضر بن محمد کہتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا کرتے تھے اور ہمارے ساتھ ایک شام کا آدمی بھی ہوتا تھا۔ جب وہ شامی (فراغت کے بعد) وطن کو واپس جانے لگا تو امام ابوحنیفہؒ سے رخصت ہونے کے لئے آیا۔ امام ابوحنیفہؒ نے اس سے پوچھا: ”اے شامی! کیا تم اس کلام (فقہ) کو بھی اپنے ساتھ شام کی طرف لے جاؤ گے؟“ شامی نے جواب دیا: ”ہاں!“ اس پر امامؒ نے فرمایا: ”خیال رکھنا۔ تم بڑے ستر کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہو“ خطیب ج ۱۳ ص ۱۲۰۔ مزاحم بن زفر کہتے ہیں کہ میں نے خود امام ابوحنیفہؒ سے سوال کیا کہ جو کچھ آپ فتویٰ دیتے ہیں یا اپنی کتابوں میں درج فرماتے ہیں کیا یہ سب حق ہے جس میں شک شبہ کی گنجائش نہیں؟ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا: ”بجائے معلوم نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ باطل ہو اور اس کے باطل ہونے میں کسی شک شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ امام زفر فرماتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا جایا کرتے تھے جو کچھ امام ابوحنیفہؒ فیصلے فرماتے، ہم ان کو لکھ لیا کرتے تھے امام زفرؒ کہتے ہیں کہ ایک دن امام ابوحنیفہؒ نے ابو یوسفؒ سے فرمایا: ”یعقوب! تیرا ناس ہو، جو کچھ تو مجھ سے سنتا ہے“ اسے سب کا سب نہ لکھ لیا کہ کج میری کچھ رائے ہوتی ہے اور کل میں اُسے چھوڑ دیتا ہوں۔ ابو نعیمؒ کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ کو ابو یوسفؒ سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مجھ سے کوئی مسئلہ نقل نہ کرو کیونکہ بخدا

مجھے خبر نہیں کہ میں (اپنے اجتہاد میں) خطا کار ہوں یا مصیب (ایضاً) سہل بن مزاحم کہتے ہیں کہ میں اکثر امام ابوحنیفہؒ کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنتا تھا فہش عبادی الذین يستمعون القول فيستبعون (احسنہ)۔ یعنی اسے پیغمبر امیر سے ان جندوں کو بشارت دید و جو باتوں کو سنتے ہیں اور کچھ ان میں جو اچھی بات ہوتی ہے اس کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔ (ایضاً ج ۱۳۔ ص ۳۵۲) حسن بن زیاد نووی کہتے ہیں کہ ہمارا یہ قول (فقہ) ایک رائے ہے جو بہتر سے بہتر ہم قائم کر سکتے ہیں جو حمار سے قول سے بہتر رائے لاسکے تو وہی صحت سے زیادہ قریب ہوگی ۹ (ایضاً)

ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ خود رسول اللہ کے زمانے میں جزئی قوانین باہمی مشاورت سے طے پایا کرتے تھے اور جو معاملات مشورے سے طے پائیں وہ ناقابل تغیر و تبدل قرار پائیں سکتے۔ اس ضمن میں بغدادی نے لکھا ہے کہ: محمد بن موسیٰ کہتے ہیں کہ میں نے یوسف بن اسباط سے سنا کہ امام اعظمؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر رسول اللہ مجھے پاتے اور میں آپ کو پانا تو بہت سی باتوں میں یقیناً آپ میرے قول کو اختیار فرما لیتے۔ (اور ابو اسحق کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ابوحنیفہؒ کے سامنے اکثر نبی کی حدیثیں آتیں اور وہ ان سے اختلاف کرتے۔ (بغدادی۔ جلد ۱۳۔ ص ۲۸۵)

آپ کے اسی مسلک کی تشریح کرتے ہوئے بغدادی نے لکھا ہے:

ابوہوانہ نے بیان کیا کہ میں ایک روز ابوحنیفہؒ کے پاس بیٹھا تھا کہ سلطان کی طرف سے ایک ایلیٰ آیا۔ اس نے کہا کہ امیر نے پوچھا ہے کہ ایک آدمی نے شہد کا چہرہ چرا لیا ہے۔ اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ ابوحنیفہؒ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا کہ اس کی قیمت اگر دس درہم ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ ایلیٰ چلا گیا تو میں نے ابوحنیفہؒ سے کہا کہ تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ رسول اللہ کا ارشاد ہے کہ پہل چلواری کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جاسکتا۔ غنا اس آدمی کی حد کو پہنچے ورنہ امیر کے ہاں اس شخص کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ ابوحنیفہؒ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے کہا کہ وہ حکم گزر چکا اور ختم ہو چکا ہے۔ (ایضاً۔ ص ۲۹)

امام اعظمؒ کے قول کا آخری ٹکڑا قابل غور ہے۔ آپ نے یہ نہیں کہا کہ مجھے اس میں شک ہے کہ وہ ارشاد رسول اللہ کا ہے یا نہیں۔ آپ نے کہا یہ کہ اگر وہ رسول اللہ کا ارشاد تھا تو بھی وہ فیصلہ اس زمانے کے حالات کے مطابق تھا۔ اب حالات بدل چکے ہیں اس لئے اب فیصلہ موجودہ حالات کے مطابق ہونا چاہیئے۔

(۱۰)

اصول قانون سازی کے سلسلے میں جو کچھ علامہ اقبالؒ نے کہا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ ابدی اور غیر متبدل قرآن مجید کے احکام، اصول اور اقدار ہیں جنہیں وہ حدود اللہ کہہ کر بچا کرتا ہے۔ ہر اسلامی مملکت اس کی مجاز ہوتی ہے کہ وہ ان حدود کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق جزئی قوانین اور طریق کار خود متعین کرے۔ ایسا کرنے میں وہ سابقہ اقدار کے قوانین سے بطور نظر انداز استفادہ کر سکتی ہے لیکن وہ ان کی پابندی پر مجبور نہیں ہوتی۔ اس باب میں وہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ایک قول نقل کرتے ہیں جو بڑا بصیرت افروز ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور نمبر

استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوع انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں، لیکن ان اصولوں کا نفاذ اُس قوم کی عادات و عیادت کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رد سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصد بالذات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ (خطبات - تشکیل جدید - چھٹا خطبہ)

اگر تشکیل پاکستان کے بعد علامہ اقبالؒ زندہ رہتے تو وہ اسی اصول کے مطابق قوانین مرتب فرماتے اور اس طرح صواب کے بعد ایک بار پھر مسلمانوں کی ایک مملکت کو صیغہ معنوں میں اسلامی بنا دیتے۔ لیکن ہماری بد قسمتی کہ وہ اس سے بہت پہلے دنیا سے تشریف لے گئے اور اسلامی قوانین کے جس نظریہ اور مسلک کے خلاف انہوں نے اس قدر جہاد کیا تھا وہ یہاں غالب آگیا۔ اور اس خطہ زمین کو اسلامی مملکت بنانے کا جو حین خواب اقبالؒ نے دیکھا تھا، وہ خواب پریشاں بن کر رہ گیا۔ قوانین حدود کی جو پہلی قسط حال ہی میں نافذ ہوئی ہے وہ اس کی بدیہی شہادت ہے۔

کسی ایک دور کے حالات کے مطابق مرتب کردہ قوانین کو غیر متبادل قرار دے دینے میں بنیادی نقص یہ ہوتا ہے کہ وہ قوانین آنے والے زمانوں کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اس لئے ان پر عمل کرنا یا کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے۔ حالیہ قوانین میں سے تین (ذنا، سرقت اور قذف) کی سزائیں تو قرآن کریم کی مقرر کردہ ہیں لیکن ان جرائم کے ثبوت وغیرہ کی شرائط اور طریق کار فقہ کی روش سے معین کیا گیا ہے۔ اس طریق کار کی رد سے ان قوانین پر عمل درآمد میں جو دشواریاں پیش آرہی ہیں یا آئیں گی وہ قابل غور ہیں۔ مثلاً :-

(۱) ان جرائم کے اثبات کا مدار شہادات پر رکھا گیا ہے اور گواہوں کے متعلق شرط یہ ہے کہ وہ الزامیہ (TRUTHFUL) ہوں اور گناہ کبیرہ کے مرتکب نہ ہوئے ہوں (اسے فقہی اصطلاح میں تزکیۃ الشہود کہا جاتا ہے) فقہ کی روش سے گناہ کبیرہ کی فہرست ایسی طویل طویل ہے کہ شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو اس کی زد میں نہ آجاتا ہو۔ یہی شرائط حج کے لئے بھی ہیں جس زمانے میں یہ شرائط مقرر کی گئی تھیں، اُس میں حالات کیا تھے اس کا تو ہمیں علم نہیں، لیکن کج ہمارے معاشرے میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا شخص ملے جو ان شرائط پر پورا اترے۔ ظاہر ہے کہ اول تو تمام کے تمام اور نہ تنانوے فیصد مقدمات اسی بنا پر خارج ہو جایا کریں گے کہ گواہان (اور اکثر و بیشتر حج صاحبان) تزکیۃ الشہود کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ علاوہ ازیں جس زمانے میں ہماری فقہ مرتب ہوئی تھی، تفتیش جرائم کا ذریعہ صرف گواہوں کی شہادات ہو سکتی تھیں۔ لیکن اب اس مقصد کے لئے انواع و اقسام کے سائنٹیفک طریق تفتیش ایک دہ چکے ہیں۔ باعقداؤں کے نشانات، خون کا تجزیہ، ڈاکٹری معائنہ، کمپروں کی ٹو وغیرہ۔ ان ذرائع کا سب سے بڑا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان میں انسانی جذبات کی آلائش نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے عدل گستری کے طریق کار کو خود ہی اس لئے متعین نہیں کیا تھا کہ اسے معلوم تھا کہ جوں جوں علم انسانی وسعت اختیار کرے گا، قسم قسم کے ذرائع تحقیق و تفتیش وجود میں آتے جائیں گے۔ اپنے آپ کو ان ذرائع کے فوائد سے محروم کر لینا منشا سے خداوندی کے خلاف ہے۔

نیز، ملزم اگر مسلمان ہے تو گواہ بھی مسلمان ہونے چاہئیں۔ غیر مسلم ہے تو غیر مسلم۔



(۶) جرمِ زنا کے ثبوت کے لئے ایسے چار گواہوں کی شرط رکھی گئی ہے جنہوں نے عملِ دخول کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ آج کا دور تو ایک طرف، ہماری ہزار سالہ تاریخ میں کوئی ایسا کیس دکھائی نہیں دیتا جس میں اس قسم کی شہادت پیش ہوئی ہو۔ علاوہ اس کے کہ اس قسم کی شہادات کا میسر آنا ناممکن ہے، اس میں ایک اور خطرہ بھی لاحق ہے۔ فقہ کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر کسی مقدمہ میں (مثلاً) تین عینی گواہ ہوں اور چوتھا گواہ یہ کہہ دے کہ میں نے دخول کو تو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا البتہ اس مرد اور عورت کو ایک ہی لحاف میں لپیٹے ہوئے دیکھا ہے تو یہ شہادت قابلِ اعتبار تصور نہیں ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملزم کو بری ہو جائے گا لیکن اول الذکر تین گواہوں پر قذف کی سزا وار دے دی جائے گی کیونکہ انہوں نے ایک بے گناہ کے خلاف زنا کی تہمت لگائی ہے۔

زنا بالجبر میں یہ صورت اور بھی نزاکت اختیار کر جائے گی۔ مظلوم عورت ایک متعین مرد کے خلاف فریاد کرے گی اور جب وہ اس کے ثبوت میں چار عینی گواہ پیش کر سکے گی تو وہ مرد تہہ گناہ قرار پا جائے گا اور اس عورت پر قذف قذف صادر ہو جائے گی۔

(۳) سرقہ کے جرم کے اثبات کے لئے اسی قسم کے دو گواہوں کی شرط لازم قرار دی گئی ہے۔ ان میں مدعی شامل نہیں ہوگا۔ اگر دو کی جگہ گواہ ایک ہی ہو تو جرم ثابت نہیں ہو سکے گا۔ دو گواہوں کے علاوہ کسی قسم کے تفتیشی ثبوت کی گنجائش نہیں رکھی گئی۔

(۴) ان تصریحات سے واضح ہے کہ فقہی طریق کار کی رُو سے شاید ہی کوئی جرم پایہ ثبوت تک پہنچ سکے۔ اس مشکل کے حل کے لئے ان قوانین میں کہا گیا ہے کہ اگر اس طریق سے جرم ثابت نہ ہو سکے تو مروجہ قوانین کی مطابق مقدمہ کا فیصلہ کر دیا جائے۔ بالفاظِ دیگر کہا یہ گیا ہے کہ جب اسلامی قوانین مؤثر ثابت نہ ہوں کیونکہ وہ ناممکن العمل ہیں تو پھر اپنی غیر اسلامی قوانین کی طرف رجوع کیا جائے جو اس وقت ملک میں نافذ ہیں اور جنہیں اسلامی قوانین سے بدلنے کے لئے اس تدریج و دو کی جارہی ہے۔ سوچئے کہ اس سے دنیا اسلام کے متعلق کیا تصور قائم کرے گی۔ کیا اس کا یہ تاثر اور اعتراض مؤثر نہ ہو جائے گا کہ اب اسلامی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔

یہ سب اس لئے ہے کہ ہم نے ہزار سال پہلے کے فقہاء کے وضع کردہ قوانین کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے۔

(۵) ہم نے جو اوپر کہا ہے کہ ان قوانین کی رُو سے جرائم پایہ ثبوت تک پہنچ ہی نہیں سکیں گے تو یہ ہمارا ہی خیال نہیں، خود مختار صدرِ مملکت کو بھی اس کا احساس ہے جس کا اظہار انہوں نے پچھلے دنوں امریکی ٹی۔ وی ٹیم کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا تھا۔ ٹی۔ وی ٹیم نے اعتراض کیا تھا کہ اس قسم کے قوانین کس طرح عدلِ انسانی کے مطابق کہلا سکتے ہیں؟ اس کے جواب میں صدرِ محترم نے فرمایا تھا:

سوال: مغرب میں بعض لوگ مسلمانوں کو وحشی سمجھتے ہیں۔ مثلاً ان کے لئے یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹ دینا کس طرح عدلِ انسانی کہلا سکے گا؟

جواب: یہ ٹھیک ہے۔ میں اس کی وضاحت اس طرح کروں گا۔ اسلام تعذیب (PUNISHMENT) کے مقابلہ میں تنوید یا تہدید (DETERRENCY) پر زیادہ زور دیتا ہے۔ لیکن اگر آپ اس فلسفہ



پر نگاہ رکھیں جو ان (نام نہاد) سنگین سزائوں (مثلاً باعہ کاٹ دینا یا ہاتھ اور پاؤں دونوں کاٹ دینا یا سنگسار کر دینا) کے پیچھے کارفرما ہے تو آپ دیکھیں گے کہ اس قانون شہادت کی رو سے جس کا نفاذ کیا جا رہا ہے ایک فی ہزار مجرموں کو بھی یہ سزائیں نہیں دی جاسکیں گی۔ اسلام صرف سزائیں مقرر نہیں کرتا۔ وہ پہلے یہ بھی متعین کرتا ہے کہ جو شخص ایسے مقدمات کے فیصلے کرے گا وہ کس قسم کا ہے۔ ان جہوں یا قاضیوں کے لئے جو اس قسم کے مقدمات کی سماعت کریں گے، بڑی کڑی شرطیں عائد کی گئی ہیں۔ وہ ایسا شخص ہونا چاہیے جس کی سیرت اور کردار کے خلاف انگشت نمائی نہ کی جاسکے۔ اسے انتہائی دیا مندار ہونا چاہیے۔ اسے اچھا مسلمان ہونا چاہیے۔ اسے کسی کے خلاف تعصب نہیں ہونا چاہیے۔ (یعنی اسے انتہائی غیر جانبدار ہونا چاہیے)۔ یہ تو رہیں اس جج کی خصوصیات جو ایسے مقدمات کی سماعت کرے گا۔ جہاں تک ان شہادت کا تعلق ہے جو اثبات جرم کے لئے پیش کی جائیں، تو ان کے بارے میں بھی ایسی کڑی شرائط عائد کی گئی ہیں جن کی رو سے کسی ایسے شخص کا مجرم قرار پانا ناممکن ہو گا جس کے ارتکاب جرم کے بارے میں ذرا سا بھی شک و شبہ ہو۔ مثلاً گواہ کو عینی شاہد ہونا چاہیے۔ وہ ایسا شخص ہونا چاہیے جس نے ہمیشہ سچ بولا ہو۔ کبھی جھوٹ نہ بولا ہو۔ جس کا کیریکٹر ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہو۔ نیز اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ملزم سے یہ جرم پہلی بار صادر ہوا ہے تو متعلقہ عدالت سزا کے تعین میں اس کا خاص خیال رکھے گی۔ اکثر احادیث نبویؐ میں آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جب اس قسم کے جرائم کا مقدمہ سامنے آئے جو قطعید وغیرہ سزائوں کے مستوجب ہوں تو کوشش کرنی چاہیے کہ کوئی ایسا عذر مل جائے جس کی روشنی میں نرم سزا دی جاسکے خواہ اس میں کھوڑا سا شک بھی کیوں نہ ہو۔ (یعنی ذرا سے شک کا فائدہ بھی ملزم کو ملنا چاہیے)

سوال: اس کا مطلب تو یہی ہوتا کہ ان سزائوں کا بنیادی مقصد تخویف ہے۔

جواب: یہ ٹھیک ہے۔ بنیادی مقصد تخویف ہی ہے۔ ان سزائوں کے سلسلہ میں یہ وہ اہم پہلو ہے جس کے نظر انداز کرنے سے اہل مغرب کو غلط فہمی لاحق ہو جاتی ہے۔ وہ اسے بھول جاتے ہیں کہ قانون شہادت۔ جہول کی تعیناتی۔ گواہوں کے متعلق شرائط۔ (یعنی وہ پورے کا پورا ضابطہ جس کی رو سے کسی ملزم کے مجرم یا بے گناہ ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا، ایسا سخت ہے کہ ایک ہزار میں سے بشکل ایک مقدمہ ایسا ہو گا جس میں یہ انتہائی سزائیں دی جاسکیں گی۔

یعنی یہ نہیں کہ ان قوانین میں مقرر کردہ سخت سزائوں کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ملک میں جرائم کا خاتمہ ہو جائے گا بلکہ یہ کہ یہ سزائیں دی ہی نہیں جاسکیں گی، اس لئے انہیں سنگین یا وحشیانہ قرار نہیں دیا جاسکتا!

یہ تو رہیں ان فقہی قوانین کے داخلی استقام کی مثالیں۔ جہاں تک ان کے عمومی اطلاق کا تعلق ہے، صورتِ حالات

اس سے بھی کہیں نازک اور شدید ہے۔ آپ کسی فرقہ کی فقہ کے قوانین بھی ناظر کر دیں، دوسرے فرقے انہیں کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔ وہ ان کے خلاف احتجاج کو

اپنا مذہبی تقاضا قرار دیں گے۔ مذہبی تقاضا کس قدر شدید ہوتا ہے، اس کا اندازہ ایک مثال سے لگا لیجئے۔ تشکیلِ پاکستان کے روزِ اول سے اس وقت تک ملک میں غیر اسلامی قوانین رائج چلے آ رہے ہیں۔ کسی فرقہ نے آج تک یہ نہیں کہا کہ ہم انہ

## فرقہ وارانہ اعتراضات

قوانین کی اطاعت نہیں کریں گے۔ لیکن جو یہی یہاں ایک فرقہ کے فعلی قوانین نافذ کئے گئے تو دوسرے فرقہ کی طرف سے صدارے احتجاج بلند ہو گئی کہ ہمارے لئے یہ قوانین قابل قبول نہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ فرقہ دارانہ یہی تقاضوں کی شدت کیسی ہوتی ہے۔

(۰)

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے، تشکیل پاکستان کے بعد اگر علامہ اقبالؒ ہم میں موجود ہوتے تو یہاں شرعی قوانین ان کے پیش کردہ اصول کے مطابق آسانی سے مرتب ہو جاتے۔ اس اصول کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم تشکیلاتی فکر و نظر کا شکار ہو رہی ہے۔ پہلے یہ کہا گیا کہ یہاں تائید سنت کے مطابق قوانین وضع ہونگے۔ بیس برس کے بعد مودودی صاحب نے فرمایا کہ کتاب و سنت کی روش سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں کیا جاسکتا جو تمام فرقوں کے لئے قابل قبول ہو۔ اس کا علاج یہ بتایا گیا کہ یہاں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے۔ پھر حنفی فرقوں نے اس کے خلاف شور مچایا تو بات دب گئی۔ اب جو قوانین نافذ ہوئے ہیں تو وہ فقہ حنفی پر متفرع ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان کی مخالفت ہو رہی ہے بلکہ وہ ناممکن العمل بھی ہیں۔ فقہ کے متعلق خود مودودی صاحب کے جو خیالات ہیں ان کی روشنی میں سمجھ میں نہیں آتا کہ انہوں نے کیسے تجویز کر دیا کہ یہاں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے۔ ان کا ارشاد ہے:-

- (۱) اس مسخ شدہ مذہبیت میں بنیادی لفظ یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منہدم شہر بنا کر رکھ دیا گیا ہے (ترجمان القرآن بابت محرم ۱۳۷۰ھ)
- (۲) مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال کیوں نہ ہو، زمان و مکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا۔ نہ اس کی نظر تمام اہم مسائل و احوال پر وسیع ہو سکتی ہے۔ لہذا اس کے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔ (تفہیمات حصہ دوم - ص ۲۶)
- (۳) انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی الہامی کتاب سے اقتساب کر کے اجتہاد کرے، دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد دنیا کے لئے دائمی قانون اور اعلیٰ قاعدہ نہیں بن سکتا کیونکہ انسانی عقل اور علم ہمیشہ زمانہ کی قید سے مقید ہوتا ہے۔ (تنقیحات - ص ۱۲)

اس کے برعکس

تمام زمانی و مکانی قیود سے آزاد اگر کوئی ہے تو وہ صرف خداوند عالم ہے جس کے پاس حقیقی علم ہے، اور جس کے علم میں

زمانہ کے تغیرات سے ذرا برابر کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ (تنقیحات - ص ۱۲)

اور یہ علم خداوندی اس کی کتاب کے اندر محفوظ ہے۔ لہذا، وہی قوانین اسلامی بھی کہلا سکیں گے اور ممکن العمل بھی ہونگے جو خدا کی کتاب کی روشنی میں، اس اصول کے مطابق مرتب کئے جائیں جس کی تفصیل گذشتہ صفحات میں گذر چکی ہے۔ اگر مختلف فرقے اس اصول کو تسلیم نہیں کرتے تو نہ متفق علیہ اسلامی قوانین مرتب ہو سکتے ہیں، نہ اسلامی مملکت وجود میں آ سکتی ہے۔

**قرآنی قوانین** لہذا الحمد کہ پرفیزہ صاحب کی تازہ ترین تصنیف **قرآنی قوانین** ملک میں بیدار مقبول ہو رہی ہے اور اس کی افادی اہمیت نکھر کر سامنے آرہی ہے اس سے نظر آتا ہے کہ

اس کا پہلا ایڈیشن جلد ختم ہو جائے گا۔ اگر آپ نے اسے ابھی تک حاصل نہیں کیا تو جلد ہی منگوا لیجئے۔

قیمت فی جلد (مجلد) میں ۲ روپے (علاوہ محصول ڈاک) ملنے کا پتہ

۱) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور۔ (۲) ادارہ طلوع اسلام ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور۔